SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:3 (2024) PAGE NO: 405-411
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: Dr. Raheela Kausar, & Dr. Saima Ali. (2024). Karbala as a poetic metaphor in Mustafa Zaidi's Poetry : مصطفیٰ زیدی کی شاعری میں کربلا کا استعارہ. *Shnakhat*, 3(3), 405-411. Retrieved from https://shnakhat.com/index.php/shnakhat/article/view/364

" Karbala as a poetic metaphor in Mustafa Zaidi's Poetry
مصطفیٰ زیدی کی شاعری میں کربلا کا استعارہ"

Dr. Raheela Kausar[1] Dr. Saima Ali[2]

Assistant Professor Urdu Minhaj University Lahore
Associate Professor, Department of Urdu, DIOL, University of Education, LMC, Lahore at-saima.ali@ue.edu.pk

Abstract
The Battle of Karbala, a pivotal event in Islamic history, has served as a profound source of inspiration for poets across generations. In the poetry of Mustafa Zaidi, Karbala emerges not merely as a historical incident but as a powerful metaphor for themes of sacrifice, justice, and resistance against tyranny. This paper explores how Zaidi intricately weaves the narrative of Karbala into his poetic expressions, utilizing its imagery and emotional weight to convey deeper philosophical and existential reflections. Through a close reading of selected poems, the study highlights the ways in which Zaidi employs Karbala to address contemporary issues, offering a lens through which readers can understand the ongoing struggles for justice and moral integrity. The examination reveals that for Zaidi, Karbala transcends its historical context, becoming a timeless symbol of human resilience and the quest for truth in the face of oppression.

Key Words: Karbala, Mustafa Zaidi, poetry, metaphor, sacrifice, justice, resistance, tyranny, existentialism, Islamic history

مرثیے کی روایت کا سلسلہ صدیوں کا سفر طے کر چکا ہے۔ رثائی ادب کی روایت برصغیر کے شعرا میں رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر ہمیشہ معتبر رہی ہے۔ رثائی ادب کا عروج انیس و دبیر کے ساتھ خاص ہو گیا۔ مگر رثائی ادب کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔ بیسویں صدی کے اہم مرثیہ گو شعرا میں شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی جمیل مظہری، سید آل رضا، امیر رضا مظہری، نسیم امروہوی، ڈاکٹر صفدر حسین، صبا اکبر آبادی، نجم آفندی، زائر سیتاپوری، امید فاضلی، اور ڈاکٹر وحید اختر کے نام قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ کئی غیر مسلم شعرا کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں مرثیے کی اہمیت، فوقیت، مذہبی معنویت، تقدیس و تحریم اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس نے بحیثیت صنف کئی نسلوں کی ذہنی تربیت و آبیاری کی ہے۔ یہ ہماری شعریات کا ایک باقاعدہ حصّہ

ہے۔اس کے فکری اور اسلوبیاتی رویے ہماری شعری فکشن میں رچ بس گئے ہیں۔ہر شاعر اپنی فکشن خود بناتا ہے۔ مگر نسلی اور حیاتیاتی ادوار سے منسلک ماضی کی قدیم ترین تہوں تک پھیلے ہوئے احساس، واقعات اور اساطیری رویے نئی شعری فکشن کی بنیاد کا کام کرتے ہیں۔ تخلیق کاری کی زمین جتنی زرخیز ہوتی ہے اسی قدر قدیم ترین تہوں تک پھیلے ہوئے واقعات و حکایات متعین معنی میں نئے ابعاد کا اضافہ کرتے ہیں۔عہد در عہد معانی کے لبادے بدلتے رہتے ہیں۔ایک ہی واقعے کے کئی اور رُخ اور ایک ہی رُخ کے کئی اور واقعات کے سلسلے کو جوڑ کر نئی کہانی اور نئے معانی پیدا کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اساطیری کہانیاں عہدِ حاضر کے تناظر میں ظہور کر کے شاعر سے نئے نئے امیجز بنواتی ہیں۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ فکریات و اسالیب، تہذیبی روایت کو عصری تناظر میں لا کھڑا کرتی ہیں۔اور وقت کی موجوں میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں گویا معتبر تاریخی حوالے نئے معنیاتی تناظر میں ظہور کر کے عصری حسیت کو بھی معتبر بنا دیتے ہیں۔

سانحہ کربلا کا حوالہ رثائی ادب کے توسط سے عام اُردو شاعری میں نئے معنیاتی مضمرات کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے اُردو شاعری میں ایک جہت سانحہ کربلا کی معنیاتی سطحوں کی بھی ہے جو رثائی ادب سے جُدا اپنے معنی متعین کرتی ہے اس نے ایک شعری رجحان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جو بہت اہمیت کی حامل ہے اس شعری اظہار میں بنیادی حوالہ تو اسی مذہبی تاریخی روایت سے لیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں استعاراتی اور علامتی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں شاعر اس حوالے کا تعلق اپنے عہد کے جبر، استحصال اور ناانصافی کے سامنے ڈٹ جانے سے جوڑتا ہے حق اور صداقت کے لیے مسلسل نبرد آزمائی اور انسانیت کی بقا اور بحالی کے لیے مر مٹنے کے لیے یہ استعارہ آفاقی معنویت کا حامل بن جاتا ہے۔

اُردو شاعری میں سانحہ کربلا بہ طور شعری استعارہ گہرے ساختیاتی اور معنیاتی مضمرات رکھتا ہے۔ واقعہ کربلا کے تاریخی حوالے کا استعاراتی اظہار غزل کی کلاسیکی روایت میں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی عہد میں اس معنیاتی استعارے کا بنیادی استعمال ظاہری داری اور باطنیت کی آویزش کے لیے ہوتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں اس کے استعمال کا پس منظر بدل گیا۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی میں برصغیر کے نشاۃ ثانیہ اور عہد جدید میں داخل ہونے کے بعد بالخصوص سیاسی المیہ 1857ء کے بعد عہد وسطیٰ کا ظاہر داری اور باطنیت کی آویزش کا روحانی ساختیہ ایک نئے سیاسی سماجی ساختیے کو راہ دیتا ہے۔اب اس میں حق و باطل یا خیر و شر کے معنی بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ غیر ملکی استحصالی قوتیں یا برطانوی سامراج اب باطل یا شر ہے اور اس کے خلاف ستیزہ کاری یا جدوجہد کرنا عین حق اور خیر ہے۔۔۔۔"(1)

یہ رجحان صحیح معنوں میں حالی اور آزاد کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں آگے بڑھا۔ مولانا محمد علی جوہر، اقبال، جوش، فراق، فیض، مخدوم، علی سردار جعفری، مجید امجد، منیر نیازی اور مصطفیٰ زیدی سے آگے تک بھی یہ روایت رثائی ادب سے الگ اپنے نئے تخلیقی رجحان کو بدلتے ہوئے سماجی منظر نامے کے ساتھ سنوارتی رہی ہے۔ نظم "بازار" کا یہ شعر دیکھیے:

اصولوں کی مظلومیت کون دیکھے کسے اِس کی جرات کہ اس کربلا میں
اماموں کا خوں در بہ در بہہ چکا ہے، رسولوں کے نقش قدم بک چکے ہیں(2)

نظم "بنام ادارہ لیل و نہار" کے ان اشعار میں بھی سانحۂ کربلا کی استعاراتی ترسیل ہے۔

نامِ حسینیت پہ سرِ کربلائے عصر
کس کا علم ہے کس کے علمدار دیکھنا
اے غم گسار! "مجلس لیل و نہار" میں
کس کی عزا ہے، کیسے عزادار دیکھنا
مجھ پہ چلی ہے عین بہ ہنگامۂ سجود
اِک زہر میں بجھی ہوئی تلوار دیکھنا
کرنا کوئی تو کوفۂ احباب کا سفر
(3)کوئی مرا سقیفۂ دلدار دیکھنا

مصطفیٰ زیدی نے اپنی نظم اور غزل میں واقعۂ کربلا کا بلاواسطہ اور بالواسطہ تخلیقی اظہار کیا ہے۔اس روش کا تعلق کچھ تو جوش سے قریبی مراسم سے تھا۔کچھ ترقی پسندی تحریک کے بغاوت اور انقلاب و آزادی کے موضوعات سے تھا۔لیکن صحیح معنوں میں اس رجحان کو فروغ جدید شاعری کے دور میں ہوا اس دور میں مصطفیٰ زیدی کے یہاں بطور شعری تھیم یہ استعارہ تخلیقی اظہار کی کئی شکلیں بدلتا ہے۔احمد ندیم قاسمی اور فیض کے یہاں نظموں میں یہ حوالہ رثائی ادب سے الگ اپنی تخلیقی پہچان اور راہیں بناتا ہے۔مجید امجد، منیر نیازی اور احمد فراز نے اسے اپنے عہد کے آلام کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔مصطفیٰ زیدی کے یہاں کبھی دعائیہ لہجہ میں، کبھی بغاوت میں کبھی سیاست کی حشر سامانیوں کے اظہار میں، کبھی وطن کی محبت کے حوالے سے کبھی دلوں کی طہارت کے حوالے سے اور کبھی مجموعی معاشرتی صورتحال کے نوحے کے طور پر واقعہ کربلا کا استعارہ اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا ہے۔بلاواسطہ اظہار کی صورت دیکھیے:

کربلا میں تو گنہ گار ہوں لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے، روح سے، احساس سے عاری کیوں ہیں
اِنکی مسمار جبیں، ان کے شکستہ تیور
گردش حسنِ شب و روز یہ بھاری کیوں ہیں؟
فِلس و دینار و توجّہ کے بھکاری کیوں ہیں؟

نظم کے تیسرے اور آخری بند میں اپنے عہد کی بے مائیگی ذہن پہ شاعر کا گریہ ہے کہ:

دل کو تہذیب تمنا میں خدا ملتا ہے
جنبش یک لب عیسیٰ میں خدا ملتا
شورِ ناقوس و نظارا میں خدا ملتا ہے

سنگ محراب کلیسا میں خدا ملتا ہے
تیرے دیوانوں کو اے شاہد دریائے فرات
(4)اپنی بے مائیگی ذہن میں کیا ملتا ہے؟

بالواسطہ اظہار میں تو مصطفیٰ زیدی نے معنی کے انبار دیے ہیں۔اور شامِ غریباں کے استعارے کو کئی نئے مطالب میں استعمال کیا ہے:

دھوپ اُتری تو وہی شام غریباں جس میں
(5)اپنے سینے پہ مزاروں کا گماں ہوتا ہے

تیرے آنچل میں ستارے،ترے چہرے پہ سحر
(6)کاش اِک شامِ غریباں کی خبر بھی لیتی

صبح تک آتی ہے سینے سے کسی کی آواز
(7)ہائے، یہ سلسلۂ شام غریباں، زیدی

مصطفیٰ زیدی کے شعری وجدان میں سانحۂ کربلا کے مختلف مدارج و منازل ایک پر ملال کیفیت کے ساتھ اُبھرتے رہتے ہیں اپنی تنہائی، مظلومیت خوف اور بے چارگی کے حوالے سے اظہار میں المیہ عناصر عود کر آتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر اک کو شہادت نہیں ملتی
اِک تشنگیِ آب رواں لب کے لیے ہے

نظم "آواز کے سائے" میں پکار کا ایک انداز یہ ہے۔

پہنچ چکے ہو فرات تک یا
سراب کی داستاں ہو یارو
ہماری افتاد روز و شب میں
نہ جانے کتنی ہی بار اب تک
عروس شب اپنی نرمیوں سے
سحر کو محروم کر چکی ہے
بہکتے صحرا میں دھوپ کھا کے
شفق کی رنگت اُتر چکی ہے
بہار کا تعزیہ اُٹھائے
نگارِ یک شب گزر چکی ہے

امید نو روز ہے کہ تم بھی
(8)پہار کے نوحہ خواں ہو یارو

مصطفیٰ زیدی نے واقعہ کربلا کی شعری بازیافت میں المناکی، دردانگیزی اور دعائیہ کیفیت میں اظہار کے جو پیرائے اختیار کئے ہیں۔ان میں لہجہ غیر رسمی اور منفرد ہے۔ وہ کیفیتوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ خود کردار بن جاتی ہیں، درد کی دھیمی مگر گہری لہر اس طرح کے اشعار میں ہچکولے لیتی رہتی ہے۔ کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ مدد دے"اسی طرح کے اظہار کا پیکر ہے:

لحن و آہنگ کے شہروں میں اُتر آیا ہے
(9)اجنبی خوف کا پھیلا ہوا صحرا مدد دے

یہ شعر منیر نیازی کے آفت زدہ شہروں کی دہشت اور آسیبی کیفیت کی یاد دلاتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی بھی کبھی کبھی ایسی کیفیت سے گزرتے ہیں۔چونکہ دونوں کا عہد ایک تھا دونوں کو عہد کے مسائل، مصائب کی خوفناک صورت دھارتے نظر آتے ہیں تو وہ خوف زدہ بھی ہوتے ہیں اور حیران وپریشان بھی۔ گویا اس دور کے اکثر شعرا کے کلام میں اپنے ارد گرد کے حالات کے گہرے رشتے کا پتہ چلتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کے یہاں ایسی کیفیات میں حوصلوں کی طلب کا یہ منظر ہے:

پیاس ایسی کہ زباں منہ سے نکل آئی ہے
کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مددے
حلق اصغر کی طرف ایک کماں اور کھنچی
اے ہواؤں کے رخ، اے گردش صحرا مددے
اک رسن اور بڑھی سوئے سکینہ ہُشیار
(10)اک صلیب اور ہوئی درپے عیسیٰ مددے

مصطفیٰ زیدی کی نظموں میں کربلا کا استعارہ جابجا استعمال ہوا ہے۔ نئے معنیاتی حوالوں سے بھی جگہ جگہ اس کا اظہار ملتا ہے۔ کرداروں کے حوالے بھی ہیں اور کیفیتوں کی مثالیں بھی بنائی گئی ہیں۔ پھر ان کے استعمال کی نادر نہ سہی منفرد مثالیں ضرور ملتی ہیں۔ مثلاً:

نفس ہے تشنگی کا دشتِ بے منزل
نفس ہی موجِ کوثر ہے، جہاں میں ہوں

ذات کے کرب میں، بازار کی رسوائی میں
تم بھی شامل ہو اس انبوہ کی تنہائی میں

تم بھی اک بادیہ پیما ہو خلا کی جانب
خود ہی سوچو کہ ہر ایک در سے ملا کیا آخر

کارآمد ہوئی فریاد کہ ناکام ہوئی
اپنی گلیوں میں سے کس کس نے ستایا تم کو
(11)دشتِ غربت میں کہاں صبح، کہاں شام ہوئی

گوپی چند نارنگ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"۔۔۔اس میں شک نہیں کہ مصطفیٰ زیدی کا شعری وجدان شدید طور پر المیہ ہے۔اور وہ تاریخی روایت سے فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن پُر گوئی اور مشاقی، نیز جوش ملیح آبادی کے حد سے بڑھتے ہوئے اثر نے انھیں نقصان پہنچایا۔اُن کے یہاں زورِ بیان، سلاست اور روانی تو ہے لیکن تہہِ داری نہیں اس لیے معنیاتی ابعاد پیدا نہیں ہو سکے کئی جگہ کچھ کچھ کیفیت ملتی ہے لیکن شدت کی کمی ہے۔۔۔"(12)

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ زیدی کا شعری وجدان شدید طور پر المیہ ہے لیکن اسے "شدید طور پر المیہ رنگ" کہنا درست نہ ہو گا یہ اور بات ہے کی ایک افسردگی اور ملال کی کیفیت ان کی شاعری میں ڈوبتی اُبھرتی رہتی ہے اور ایک رچی ہوئی افسردگی اس قسم کے اشعار کا خاصہ ہے:

ادھر ستائے ہوئے دل نظر بچا کے چلے
ضمیر سنگ میں شیشے کی آبرو کیا تھی
کھلے تھے زخم ستاروں کی جستجو کیا تھی
جھکی ہوئی تھیں نگاہیں، تمھے ہوئے تھے قدم
(13)سِلی ہ.وئی تھیں زبانیں، جلے ہوئے تھے علم

یہ المیہ لب ولہجہ کسی حد تک انبوہ کی تنہائی کا شاخسانہ بھی ہے یہاں استعاراتی اور علامتی پیرایے الفاظ کے منطقی رشتوں تک محدود نہیں رہے ہیں۔ بلکہ تلازموں نے بیان میں پراسراریت بھی پیدا کر دی ہے۔یہ پراسراریت، خوف اور دہشت فرد کے اکیلے پن کے احساس کے ساتھ بھی جڑی ہوئی ہے۔

حوالہ جات

گوپی چند نارنگ۔سانحہ کربلا بہ طور شعری استعارہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991ء۔ص27-28

مصطفیٰ زیدی۔کلیات۔(قبائے ساز) ص88

ایضاً۔(کوہِ ندا) ص80-82

ایضاً۔(شہر آذر) 144-145

ایضاً۔ص94

ایضاً۔(گریباں) ص26

ایضاً۔ص36

ایضاً۔(روشنی) ص102،111،112

ایضاً۔(کوہِ ندا) ص63

ایضاً۔ص64

ایضاً۔ص35،38،39

گوپی چند نارنگ۔سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،1991ء۔ص59

مصطفیٰ زیدی۔کلیات(قبائے ساز) ص44